

تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

ترتیب

- ۵ تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں
- ۶ زمام کا رکی اہمیت
- ۷ امامتِ صالح کا قیام دین کا حقیقی مقصود ہے
- ۸ امامت کے باب میں خدا کی سنت
- ۹ انسانی عروج و زوال کا مدار اخلاق پر ہے
- ۱۰ بنیادی انسانی اخلاقیات
- ۱۱ اسلامی اخلاقیات
- ۱۲ سنت اللہ در باب امامت کا خلاصہ
- ۱۳ بنیادی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کی طاقت کا فرق
- ۱۴ اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب
- ۱۵ ۱۵) ایمان
- ۱۶ ۱۶) اسلام
- ۱۷ ۱۷) تقویٰ
- ۱۸ ۱۸) احسان
- ۱۹ غلط فہمیاں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

رفقاء و حاضرین! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری جدوجہد کا آخری مقصد

”انقلاب امامت“ ہے۔ یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ
فاسق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو۔ اسی مقصد عظیم کے لیے سی و
جہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائے الہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے افسوس ہے کہ آج اس کی اہمیت سے مسلم اور
غیر مسلم بھی غافل ہیں، مسلمان اس کو محض سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ
دین میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ غیر مسلم کچھ تعصب کی بنا پر اور کچھ ناواقفیت کی وجہ سے اس حقیقت
کو جانتے ہی نہیں کہ دراصل فاسق و فجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان
کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں
کے ہاتھوں میں ہو۔ آج دنیا میں جو فساد عظیم برپا ہے، جو ظلم اور طغیان ہو رہا ہے، انسانی اخلاق
میں جو عالمگیر بگاڑ رونما ہے، انسانی تمدن و میشیت و سیاست کی رگ رگ میں، جو زہر سرایت کر گیا
ہے، زمین کے تمام وسائل اور انسانی علوم کی دریافت کردہ ساری قوتیں، جس طرح انسان کی
فلک و بہوں کے بجائے اس کی بتابی کے لیے استعمال ہو رہی ہیں، ان سب کی ذمے داری اگر کسی
چیز پر ہے تو وہ صرف بھی ہے کہ دنیا میں چاہے نیک لوگوں اور شریف انسانوں کی نہ ہو، مگر دنیا
کے معاملات اُن کے ہاتھ میں نہیں ہیں، بلکہ خدا سے پھرے ہوئے اور مادہ پرستی و بد اخلاقی میں
ذوبہ ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو

صلاح سے، اضطراب کو امن سے، بداخلا قیوں کو اخلاقی صالح سے اور برائیوں کو بھلاکیوں سے بدلنے کا خواہش مند ہوتا اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عنانصر اس کو مل سکیں انھیں ملا کروہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے، جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چینی جاسکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جاسکے۔

زمام کار کی اہمیت

انسانی زندگی کے مسائل میں، جس کو تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ انسانی معاملات کے بنا اور بگاڑ کا آخری فیصلہ، جس مسئلے پر مختصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے، جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی ست چلا کرتی ہے، جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور دوسرا لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ نا خواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے، جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں، جن کے ہاتھ میں تمدن کی پاگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع، جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار کی بائیں، جن کے ہاتھ میں ہوں، عام انسانوں کی زندگی، جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھانلنے کے وسائل جن کے قبیلے میں ہوں، افرادی سیرتوں کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشكیل اور اخلاقی قدرتوں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو، ان کی رہنمائی و فرمان روائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اُس راہ پر چلتے سے کسی طرح بازنیں رہ سکتی، جس پر وہ اُسے چلانا چاہتے ہیں۔ یہ رہنماؤ فرمان رواؤ اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو الٰہ زندگی کا سارا نظام خدا پرست اور خیر و صلاح پر چلے گا، برے لوگ بھی ایجھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلاکیوں کو نشوونما نصیب ہو گا اور برائیاں اگر میں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمان روائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فرق و فنور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلا قیوں پر چلے گا۔ خیالات و نظریات، علوم و آداب، سیاست و میشیت، تہذیب و معاشرت،

اخلاق و معاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحثیت مجموعی بگز جائیں گے۔ برائیاں خوب نشوونما پائیں گی۔ بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غزادینے سے انکار کر دیں گے اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چنان آسان اور بھلائی کی راہ پر چنان کیا معمی قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہوگا کہ سارا مجع جس طرف جا رہا ہے، اس طرف چلنے کے لیے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر اس کی مخالف سمت میں کوئی چلانا چاہے تو وہ بہت زور مار کر بھی بمشکل ایک آدھ تدم چل سکتا ہے، اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے دھکیل دیتا ہے، اسی طرح اجتماعی نظام بھی جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر و فتن کی راہوں پر میں پڑتا ہے تو افراد اور گروہوں کے لیے غلط راہ پر چلانا تو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ انھیں بطور خود اس پر چلنے کے لیے کچھ نہ ور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن اگر وہ اس کے خلاف چلانا چاہیں تو اپنے جسم و جان کا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راہ راست پر بڑھ سکتے ہیں۔ اور اجتماعی روائی کی مراجحت کے باوجود انھیں دھکیل کر میلوں پیچھے ہٹا لے جاتی ہے۔

یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے، حتیٰ ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہو، بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنا دیا ہے، جس سے کوئی صاحبِ دیدہ بینا انکار نہیں کر سکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برسوں کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات و نظریات بد لے ہیں، مذاق اور مزاج بد لے ہیں، سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بد لے ہیں، تہذیب و اخلاق کے معیار اور قدر و قیمت کے پیانا بد لے ہیں اور کون سی چیزوں کی گئی ہو۔ یہ سارا تغیر جو دیکھتے آپ کی اسی سرزی میں ہوا اس کی اصلی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتاسکتے ہیں کہ، جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کا رਹਿ ਓر رہنمائی و فرمان روائی کی باگوں پر جن کا قبضہ تھا، انھوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفیات، معاملات اور نظامِ تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا، جوان کی اپنی پسند کے مطابق تھا؟ پھر جن طاقتؤں نے اس تغیر کی مراجحت کی، ذرا ناپ کر دیکھیے کہ انھیں کامیابی کتنی ہوئی اور ناکامی کتنی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کل جو مراجحت کی

تحریک کے پیشوں تھے، آج ان کی او لا د وقت کی رو میں بھی جلی جا رہی ہے اور ان کے گھروں تک میں بھی وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے، جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں تک کی نسل سے وہ لوگ اٹھ رہے ہیں، جنہیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان میں بھی شک ہے؟ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل میں اصل فیصلہ کن مسئلہ زمامِ کار کا مسئلہ ہے؟ اور یہ اہمیت اس مسئلے نے کچھ آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کی بھی اہمیت رہی ہے۔ **النَّاسُ عَلَى دِينٍ مُّلْوِّكُهُمْ** بہت پرانا مقولہ ہے۔ اور اسی بنا پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار ان کے علماء اور امراء کو فرار دیا گیا ہے، کیوں کہ لیڈر شپ اور زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

امامتِ صالحہ کا قیامِ دین کا حقیقی مقصود ہے

اس تشریع کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آئی ہے کہ دین میں اس مسئلے کی کیا اہمیت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اول توجیہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکل یہ بندہ حق بن کر رہیں اور ان کی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کا حلقة نہ ہو۔ پھر وہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے۔ پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد میں اُن مکرات کا استیصال کیا جائے، جو اہل زمین پر اللہ کے غضب کے موجب ہوتے ہیں اور ان خیرات و حسنات کو فروغ دیا جائے جو اللہ کو پسند ہیں۔ ان تمام مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ نوع انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملاتی انسانی کی سر برآہ کاری ائمہ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دینِ حق کے پیروکھ ان کے ماتحت رہ کر ان کی دی ہوئی رعایتوں اور بخاتشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یادِ خدا کرتے رہیں۔ یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہل خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں اجتماعی قوت پیدا کریں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ایسا نظامِ حق قائم کرنے کی سعی کریں، جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمان روائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہی نہیں ہو سکتا ہے، جو دین کا اصل مدعا ہے۔

اسی لیے دین میں امامتِ صالحہ کے قیام اور نظامِ حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے۔ غور کیجیے، آخر قرآن و حدیث میں التزامِ جماعت اور سمع و طاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کر لے تو اس سے قتل واجب ہے، خواہ وہ کلمہ تو حید کا قائل اور نماز روزے کا پابند ہی کیوں نہ ہو؟ کیا اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے کہ امامتِ صالحہ اور نظامِ حق کا قیام و بقاء دین کا حقیقی مقصود ہے، اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر متوقف ہے، لہذا جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرار تو حید سے؟ پھر دیکھیے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد نظامِ حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے، جس پر آدمی کا ایمان پر کھا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جس کے دل میں ایمان ہو گا وہ نہ تو نظامِ باطل کے تسلط پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظامِ حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں جو شخص کم زوری دکھائے اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے، پھر بھلا کوئی دوسرے عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے؟

اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلے کی پوری تفصیل بیان کروں۔ مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے امامتِ صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے، جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اس کا کام صرف اتنے ہی پڑھنی ہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے ساتھ میں ڈھانے کی کوشش کرے۔ بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مکوڑ کر دے کہ زمامِ کارکفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظامِ حق قائم ہو، جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست کرے اور درست رکھے۔ پھر چوں کہ یہ مقصدِ اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے ایک ایسی جماعتِ صالحہ کا وجود ضروری ہے، جو خود اصولِ حق کی پابند ہو اور نظامِ حق کو قائم کرنے، باقی رکھنے اور نیک ٹھیک چلانے کے سوادنیا میں کوئی دوسری غرض پیش نظر نہ رکھے۔

روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی آدمی مومن ہوت بھی اس کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اور ذرا رائج مفہود دیکھ کر نظامِ باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے یا اہون البتیں کے شرعی حیلے تلاش کر کے غلبہ کفر و فتن کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے۔ بلکہ اس کے لیے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہے کہ بندگان خدا کو اس طریق زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے۔ پھر اگر کوئی اس کی بات سن کر نہ دے تو اس کا ساری عمر صراطِ مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مر جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے، جو مظلالت میں بھکی ہوئی دنیا کو مرغوب ہوں، اور ان را ہوں پر پل پڑے، جن پر کفار کی امامت میں دنیا پل رہی ہو۔ اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لیے لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جھٹا بنائے اور یہ جھٹا اپنی تمام اجتماعی قوت اُس مقصدِ عظیم کے لیے جدوجہد کرنے میں صرف کر دے، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

حضرات! مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن و حدیث کے مطالعے سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے میں دین کا تقاضا ہیں کچھ سمجھا ہوں۔ یہی میرے نزدیک کتابِ الہی کا مطالبہ ہے۔ یہی انبیاء کی سنت ہے اور میں اپنی اس رائے سے ہٹ نہیں سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہی سے مجھ پر ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا ہیں ہے۔

امامت کے باب میں خدا کی سنت

اپنی سعی کے اس مقصد و منہجا کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اُس سنت اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، جس کے تحت ہم اپنے اس مقصود کو پاسکتے ہیں۔ یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک قانون پر بنایا ہے اور اس کی ہر چیز ایک لگنے بند ہے ضابطے پر چل رہی ہے۔ یہاں کوئی سعی مغض پا کیزہ خواہشات اور اچھی نیتوں کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ مغض نفوں قدیسیہ کی برکتیں ہی اس کو بار آور کر سکتی ہیں، بلکہ اس کے لیے اُن شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے، جو ایسی مسامی کی بار آوری کے لیے قانونِ الہی میں مقرر ہیں۔ آپ اگر زراعت کریں تو خواہ آپ کتنے ہی بزرگ صفت انسان ہوں اور تسبیح و تہلیل میں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہوں، بہر حال

آپ کا پچھنا ہوا کوئی بیج بھی برگ و بار نہیں لاسکتا، جب تک آپ اپنی سماں کاشت کاری میں اس قانون کی پوری پوری پابندی ملحوظ نہ رکھیں، جو اللہ تعالیٰ نے حکیتوں کی باہر آوری کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اسی طرح نظامِ امامت کا وہ انقلاب بھی، جو آپ کے پیش نظر ہے، کبھی محض دعاوں اور پاک تمناؤں سے رونما نہ ہو سکے گا۔ بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں، جس کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے، کسی کلماتی ہے اور کسی سے چھنتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس مضمون کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اشارہ تباہی کرتا ہوں لیکن آج میں اسے مزید تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں، کیوں کہ یہ مضمون ہے، جسے پوری طرح سمجھے بغیر ہمارے سامنے اپنی راہ عمل واضح نہیں ہو سکتی۔

انسان کی ہستی کا اگر تجویز کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں، جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم بھی جملی بھی۔

اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے، جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں، جو تمام طبیعت و حیوانات پر فرماں روائی کر رہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے، ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسرا تام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کر سکتا ہے قوانین طبعی کے تحت، آلات و وسائل کے ذریعے سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتوں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔

دوسری حیثیت، جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے، یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔ یہ اخلاقی وجود طبیعت کا تابع ہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے طبعی و حیوانی وجود کو بھی آئے کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کارکنوں میں وہ اخلاقی اوصاف ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں اور اس پر فرماں روائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

انسانی عروج وزوال کا مدار اخلاق پر ہے

یہ دونوں حصیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اُس کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج وزوال کا مدار امدادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتیوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت ہی سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت ہی سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اُسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں، یا ان میں وہ دوسروں کی نسبت کم زور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر غائز نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی طاقت کی۔ اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کا حصول، طبعی ذرائع کا استعمال اور اسباب خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لیے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالم طبعی میں رہتا ہے یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ اصل چیز، جو انسان کو گرفتاری اور اٹھاتی ہے اور جسے اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اُس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے۔ آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سائنس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے۔ بلکہ اس کی وہ امتیازی خصوصیت، جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے، وہ اس کا اخلاقی اختیار اور اخلاقی ذمے داری کا حامل ہونا ہے۔ پس جب اصل جو ہر انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بنا اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج وزوال پر فرم روا ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔

ایک بنیادی انسانی اخلاقیات۔ دوسرے اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں، جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے۔ ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں، جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہر حال شرط لازم ہیں خواہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے۔ ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں، طہارت نفس اور نیت خیر اور عمل صالح سے آ راستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کے لیے کام کر رہا ہے یا بے مقصد کے لیے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو، اور اس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک، اس کی سیکھی کا مقصد اچھا ہو یا برا، جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہو گا، جو دنیا میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہو گا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا، جو ان اوصاف کے طفاظ سے اس کے مقابلے میں ناقص ہوں گے۔

مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلحت ہو یا مفید، غرض جو بھی ہو، وہ اگر کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اُسی صورت میں جب کہ اس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تخلی اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی اور جفاشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کے لیے ہر چیز قربان کر دینے کا مل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبیر ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھانلنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو، اور دوسرے انسانوں کو مونہنے اور ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔

پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائص بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں، جو فی الحقیقت جو ہر آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً خود داری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، سچائی، امانت، راست بازی، پاس عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط۔

یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں کہجھیے کہ اس کے پاس وہ سرمایہ انسانیت موجود ہے، جس سے ایک طاقت و راجتھمیت وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن

یہ سرمایہ مجتمع ہو کر بالفضل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں۔ مثلاً تمام یا بیشتر افراد کی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اُس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض، بلکہ اپنی جان، مال اور اولاد سے بھی عزیز تر رکھیں۔ ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو۔ انھیں مل کر کام کرنا آتا ہو۔ وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اُس حد تک قربان کر سکتیں، جو مقتضم سی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ صحیح و غلط رہ نما میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنارہ نہ مانایں۔ ان کے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبیر اور رہنمائی کی دوسرا ضروری صفات موجود ہوں۔ اور خود قوم یا جماعت بھی اپنے رہ نماوں کی اطاعت کرنا جانتی ہو، ان پر اعتماد رکھتی ہو، اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو۔ نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو، جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پہنچنے نہ دے، جو اجتماعی فلاج کے لیے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں ”بنیادی اخلاقیات“ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ کیون کہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں اور انسان کی مقصد کے لیے بھی دنیا میں کامیاب سی نہیں کر سکتا جب تک ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ ہو۔ ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے، جیسے فولاد کو وہ اپنی ذات میں مضبوطی و استحکام رکھتا ہے اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لیے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لیے۔ آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہوت بھی آپ کے لیے مفید وہی ہتھیار ہو سکتا ہے، جو فولاد سے بنا ہونہ کے مردی گلی مکھی مکھی لکڑی سے، جو ایک ذرا سے بو جھا اور معمولی سی چوٹ کی بھی تاب نہ لاسکتی ہو۔ بھی وہ بات ہے، جسے نبی ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ خیار کم فی الحاہلیة خیار کم فی الاسلام ”تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اپنے ہیں۔“ یعنی زمانہ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جو ہر قابل رکھتے تھے وہی زمانہ اسلام میں مردانی کا ثابت ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط را ہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آ کر انھیں صحیح راہ پر لگا دیا۔ مگر بہر حال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔ نبی ﷺ کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد دریائے

سندھ سے لے کر المانگ کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصے نے محسوس کر لیے، اُس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا، جس کے اندر کیر کنز کی زبردست طاقت موجود تھی۔ اگر خدا نے خواستہ آپ کو بودے، کم بہت، ضعیف الارادہ اور ناقابلِ اعتقاد لوگوں کی بھیزیل جاتی تو کیا پھر بھی وہ نتائج نکل سکتے تھے؟

اسلامی اخلاقیات

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبے کو لیجئے جسے میں "اسلامی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسی کی تھیج اور تکمیل ہے۔ اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز و محور مہیا کر دیتا ہے، جس سے وابستہ ہو کر وہ سر اپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں تو یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں، جو خیر بھی ہو سکتی ہے اور شر بھی، جس طرح تلوار کا حال ہے کہ وہ بس ایک کاٹ ہے، جوڑا کو کے ہاتھ میں جا کر آر لئے ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاهد فی سیمیل اللہ کے ہاتھ میں جا کر وسیلہ خیر بھی، اُسی طرح ان اخلاقیات کا بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اس کا خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو اور اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت اسلام انجام دیتا ہے۔ اسلام کی دعوتِ توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں کا اور اس کی دوڑ دھوپ کا مقصدِ توحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو وَ إِيَّاكَ نَسْأَعُ وَ نَهْدِدُ "خدایا ہماری ساری کوششیں اور ساری دوڑ دھوپ تیری ہی خوش نو دی کے لیے ہے" اور اس کا پورا دائرہ فکر و عمل اُن حدود سے محدود ہو جائے، جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں: إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّي وَ نَسْجُدُ "خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تیرے ہی لیئے نماز اور سجدے کرتے ہیں۔" اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہیں بنیادی اخلاقیات، جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور وہ قوت، جو ان اخلاقیات کی موجودگی سے ییدا ہوتی ہے، بجائے اس کے کفس یا خاندان یا قوم یا ملک کی سر بلندی پر ہر ممکن طریقے سے صرف ہو، خالص حق کی سر بلندی پر صرف جائز طریقوں ہی سے صرف ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز اُس کو ایک مجرد قوت کے مرتبے سے انھا کرایجا بنا ایک بھلائی اور دنیا کے لیے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو محکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو بیجیے۔ بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو صبر دنیوی اغراض کے لیے ہو اور جسے شرک یا مادہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذال رہی ہو، اس کی برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی بس ایک حد ہوتی ہے، جس کے بعد وہ گھبرا لختا ہے۔ لیکن جس صبر کو تو حید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کے لیے ہو، وہ تحمل و برداشت اور پارمردی کا ایک اتحاہ خزانہ ہوتا ہے، جسے دنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتیں۔ پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نویعت کا ہوتا ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی تو گلوں اور گولیوں کی بوچاڑی میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا اور ابھی جو خدمات شہوانی کی تکسیم کا کوئی موقع سامنے آیا تو نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلے میں بھی نہ ٹھیک رکا۔ لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف چند مخصوص قسم کے خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلے میں نہیں بلکہ ہر اس لامبے، ہر اس خوف، ہر اس اندیشے اور ہر اس خواہش کے مقابلے میں ٹھیک رکا کی ایک زبردست طاقت بناؤتیا ہے، جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ درحقیقت اسلام مونمن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے، جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرز عمل پر قائم رہو خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور اس کی زندگی میں اس کا کوئی مغایرہ نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے، اور کبھی فکر و عمل کی برائی اختیار نہ کرو خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوش نہاس بزرگ تمہارے سامنے لہلہ رہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور لازماً اُن شکلوں میں بھی ہوتا ہے، جو بہت محدود پیمانے پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ اسی مثال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں۔ کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر محکم بھی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاقی فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالائی منزل تعمیر کرتا ہے، جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں

پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے، نفسانیت سے، ظلم سے، بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے۔ اس میں خدا تری، تقویٰ و پر ہیزگاری اور حق پرستی پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر اخلاقی ذمے دار یوں کا شعور و احساس ابھارتا ہے۔ اُس کو ضبطِ نفس کا خونگر بنتا ہے۔ اُسے تمام مخلوقات کے لیے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض خیر خواہ، بے لوث منصف، اور ہر حال میں صادق و راحت باز بنا دیتا ہے۔ اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے، جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوّقع ہو اور برائی کا کوئی اندریشہ نہ ہو۔ پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیثِ رسولؐ کے الفاظ میں وہ اُسے مفتاح للخير مغلّق للشر (بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا) بنتا ہے، یعنی وہ ایجاداً یہ مشن اُس کے سپرد کرتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلانے اور برائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرت ناوجہ حسن ہے، وہ کشش ہے، وہ بلا کی قوت تحریر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملًا اپنے اُس مشن کے لیے کام بھی کرے، جو اسلام نے اس کے سپرد کیا ہے تو اُس کی جہاگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی وقت کے بُس کا کام نہیں ہے۔

سنت اللہ در باب امامت کا خلاصہ

اب میں چند الفاظ میں اس سنت اللہ کو بیان کیے دیتا ہوں، جو امامت کے باب میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک نوع انسانی اپنی موجودہ نظرت پر زندہ ہے اُس وقت تک برابر جاری رہے گی اور وہ یہ ہے۔

اگر دنیا میں کوئی منظم انسانی گروہ ایسا موجود نہ ہو، جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں سے آراستہ ہو اور پھر مادی اسباب و وسائل بھی استعمال کرے، تو دنیا کی امامت و قیادت لازماً کسی ایسے گروہ کے قبضے میں دے دی جاتی ہے، جو اسلامی اخلاقیات سے چاہے بالکل ہی عاری ہو لیکن بنیادی انسانی اخلاقیات اور مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ یہر حال اپنی دنیا کا انتظام چاہتا ہے اور یہ انتظام اُسی گروہ کے سپرد کیا جاتا ہے، جو موجوداً الوقت گروہوں میں اہل تر ہو۔ لیکن اگر کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو، جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات

دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو، اور وہ مادی اسے سب و سائل کے استعمال میں بھی کوتا ہی نہ کرے، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلوں میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، اللہ کی اُس سنت کے خلاف ہے، جو انسانوں کے معاملے میں اُس نے مقرر کر لی ہے، ان وعدوں کے خلاف ہے، جو اللہ نے اپنی کتاب میں مومنین صالحین سے کیے ہیں اور اللہ ہرگز فساد پسند نہیں کرتا کہ اُس کی دنیا میں ایک صالح گروہ انتظام عالم کو ٹھیک ٹھیک اُس کی رضا کے مطابق درست رکھنے والا موجود ہو اور پھر بھی وہ مفسدوں ہی کے ہاتھ میں اس انتظام کی باغ ڈور رہنے دے۔

مگر یہ خیال رہے کہ اس نتیجے کا نتھور صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک جماعتِ صالحہ ان اوصاف کی موجود ہو۔ کسی ایک صالح فرد، یا متفرق طور پر بہت سے صالح افراد کے موجود ہونے سے استخلاف فی الارض کا نظام تبدیل نہیں ہو سکتا، خواہ وہ افراد اپنی جگہ کیسے ہی زبردست اولیاء اللہ بلکہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ نے استخلاف کے متعلق جتنے وعدے بھی کیے ہیں، منتشر و متفرق افراد سے نہیں، بلکہ ایک ایسی جماعت سے کیے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو عملًا "خیرِ امت" اور "امت وسط" ثابت کر دے۔

نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک گروہ کے محض وجود میں آجائے ہی سے نظامِ امامت میں تغیر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھروہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فساق و فیار کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انھیں مند نشین کر دیں۔ بلکہ اس جماعت کو کفر و فرق کی طاقتؤں سے زندگی کے ہر میدان میں، ہر ہر قدم پر ٹکٹکش اور مجاهدہ کرنا ہو گا اور اقامتِ دین کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبت حق اور اپنی اہمیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے، جس سے انبیاء تک مستثنی نہ رکھے گئے، کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنی ہونے کی توقع کرے۔

بنیادی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کی طاقت کا فرق

مادی طاقت اور اخلاقی طاقت کے تناست کے باب میں قرآن اور تاریخ کے غائر مطالعے سے، جو سنتِ اللہ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں اخلاقی طاقت کا سارا انحصار صرف بنیادی انسانی اخلاقیات پر ہو۔ وہاں مادی وسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس امر کا بھی

امکان ہے کہ اگر ایک گروہ کے پاس مادی وسائل کی طاقت بہت زیادہ ہو تو وہ تھوڑی اخلاقی طاقت سے بھی دنیا پر چھا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اخلاقی طاقت میں فائٹر ہونے کے باوجود محض وسائل کی کمی کے باعث دبے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں اخلاقی طاقت میں اسلامی اور بنیادی دونوں قسم کے اخلاقیات کا پورا زور شامل ہو وہاں مادی وسائل کی انتہائی کمی کے باوجود اخلاق کو آخ کاراً ان تمام طائقتوں پر غلبہ حاصل ہو کر رہتا ہے، جو مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی سروسامان کے بل بوتے پڑھی ہوں۔ اس نسبت کو یوں سمجھیے کہ بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اگر سورجے مادی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو اسلامی اور بنیادی اخلاقیات کی مجموعی قوت کے ساتھ صرف ۲۵ درجے مادی طاقت کافی ہو جاتی ہے، باقی ۷۵ فی صدی قوت کی کمی محض اسلامی اخلاق کا زور پورا کر دیتا ہے۔ بلکہ نبیؐ کے عهد کا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ اسلامی اخلاق اگر اس پیانا نہ کا ہو جو حضور اور آپ کے صحابہ کا تھا تو صرف پانچ فی صدی مادی طاقت سے بھی کام چل جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے، جس کی طرف آیت اذ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوا مَا يَتَّيَّنُ^۱ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ آخری بات جو میں نے عرض کی ہے اسے محض خوش عقیدگی پر محول نہ کیجیے اور نہ یہ گمان کیجیے کہ میں کسی مجرزے و کرامت کا آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ نہیں، یہ بالکل فطری حقیقت ہے، جو اسی عالم اسباب میں قانون علت و معلول کے تحت پیش آتی ہے اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے اگر اس کی علت موجود ہو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں اس کی تشریح کر دوں کہ اسلامی اخلاقیات سے، جن میں بنیادی اخلاقیات خود بخود شامل ہیں، مادی اسباب کی ۵۰ فیصدی تک کی کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔

اس چیز کو سمجھنے کے لیے آپ ذرا خود اپنے زمانے ہی کی بین الاقوامی صورت حال پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ ابھی آپ کے سامنے وہ فساد عظیم، جو آج سے ساڑھے پانچ سال پہلے شروع ہوا تھا۔ جرمی کی نگست پر ختم ہوا ہے اور جاپان کی نگست بھی قریب نظر آ رہی ہے۔ جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے اُن کے اعتبار سے اس فساد کے دونوں فریق تقریباً مساوی ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے جرمی اور جاپان نے اپنے حریفوں کے مقابلے میں زیادہ

۱۔ اگر ہم میں سے بیش صابر آدمی ہوں تو وہ دوسرا پر غالب آئیں گے۔ (الاتفاق: ۶۵)

۲۔ اشارہ ہے جنگ عظیم دوم کی طرف، جو اس تقریر کے وقت جاری تھی۔

زبردست اخلاقی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک علوم طبیعی اور ان کے عملی استعمال کا تعلق ہے اس میں بھی دونوں فریق برابر ہیں، بلکہ اس معااملے میں کم از کم جرمی کی فویت تو کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر صرف ایک چیز ہے، جس میں ایک فریق دوسرے فریق سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے، اور وہ ہے مادی اسباب کی موافقت۔ اس کے پاس آدمی اپنے دونوں حریقوں (جرائمی و جاپان) سے کئی گئے زیادہ ہیں۔ اس کو مادی وسائل اُن کی نسبت بدروجہ زیادہ حاصل ہیں۔ اس کی جغرافی پوزیشن اُن سے بہتر ہے۔ اور اس کو تاریخی اسباب نے اُن کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر حالات فراہم کر دیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو فتح نصیب ہوئی ہے اور اسی وجہ سے آج کسی ایسی قوم کے لیے بھی جس کی تعداد کم ہو اور جس کی دسیس میں مادی وسائل کم ہوں، اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کثیر التعدد اور کثیر الوسائل قوموں کے مقابلے میں سر اٹھا سکے، خواہ وہ بنیادی اخلاقیات میں اور طبیعی علوم کے استعمال میں اُن سے کچھ بڑھتی کیوں نہ جائے۔ اس لیے کہ بنیادی اخلاقیات اور طبیعی علوم کے بل پر اٹھنے والی قوم کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ خود اپنی قویت کی پرستار ہو گی اور دنیا کو اپنے لیے مسخر کرنا چاہے گی، یا پھر وہ کچھ عالمگیر اصولوں کی حامی بن کر اٹھے گی اور دوسری قوموں کو ان کی طرف دعوت دے گی۔ پہلی صورت میں تو اس کے لیے کامیابی کی کوئی شکل بجز اس کے ہے، ہی نہیں کہ وہ مادی طاقت اور وسائل میں دوسروں سے فائز رہو۔ کیوں کہ وہ تمام قومیں جن پر اس کی اس حرص اقتدار کی زد پڑ رہی ہو گی، انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ اس کی مزاحمت کریں گی اور اس کا راستہ روکنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گی۔ رہی دوسری صورت تو اس میں بلاشبہ اس کا امکان تو ضرور ہے کہ قوموں کے دل و دماغ خود بہ خود اس کی اصولی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جائیں اور اسے مزاحموں کو راستے سے ہٹانے میں بہت تھوڑی قوت استعمال کرنی پڑے۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ دل صرف چند خوش آیند اصولوں ہی سے مسخر نہیں ہو جایا کرتے بلکہ انھیں مسخر کرنے کے لیے وہ حقیقی خیر خواہی، نیک نیتی، راست بازی، بے غرضی، فراخ دلی، فیاضی، ہمدردی اور شرافت و عدالت درکار ہے، جو جنگ اور صلح، فتح اور شکست، دوستی اور دشمنی، تمام حالات کی کڑی آزمائشوں میں کھڑی اور بے لوث ثابت ہو۔ اور یہ چیز اخلاقی فاضلہ کی اُس بلند منزل سے تعلق رکھتی ہے، جس کا مقام بنیادی اخلاقیات سے بہت برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی طاقت کے بل پر

اٹھنے والے خواہ کھلے قوم پرست ہوں یا پوشیدہ قوم پرستی کے ساتھ کچھ عالمگیر اصولوں کی دعوت و حمایت کا ڈھونگ رچائیں، آخ کار ان کی ساری جدوجہد اور کشمکش خالص شخصی یا طبقتی یا قومی خود غرضی ہی پر آٹھیترتی ہے، جیسا کہ آج آپ امریکہ، برطانیہ اور روس کی سیاست خارجیہ میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ اسی کشمکش میں یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے مقابلے میں ایک مضبوط چٹاں بن کر کھڑی ہو جائے، اپنی پوری اخلاقی و مادی طاقت اس کی مزاحمت میں صرف کردے اور اپنے حدود میں اس کو ہرگز راہ دینے کے لیے تیار رہے ہو جب تک کہ مخالف کی برتر مادی قوت اس کو پیس کرنہ رکھ دے۔

اچھا، اب ذرا تصور کیجیے کہ اسی ماحول میں ایک ایسا گروہ (خواہ وہ ابداء ایک ہی قوم میں سے اٹھا ہو مگر "قوم" کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "جماعت" کی حیثیت سے اٹھا ہو) پایا جاتا ہے، جو شخصی، طبقاتی اور قومی خود غرضیوں سے بالکل پاک ہے۔ اس کی سماں و جہد کی کوئی غرض اس کے سوانحیں ہے کہ وہ نوع انسانی کی فلاج چند اصولوں کی پیروی میں دیکھتا ہے اور انسانی زندگی کا نظام ان پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اُن اصولوں پر جو سوسائٹی وہ بناتا ہے اس میں تو می وطنی اور طبقاتی و نسلی ایتیازات بالکل مفقود ہیں۔ تمام انسان اس میں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اس میں رہنمائی و قیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعہ اشخاص کو حاصل ہو سکتا ہے، جو ان اصولوں کی پیروی میں سب پر فوقیت لے جائے، قطع نظر اس سے کہ اس کی نسلی و طبقاتی کوئی پکھہ ہی ہو جتی کہ اس میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر مفتوج ایمان لا کر اپنے آپ کو صالح تر ثابت کر دے تو فاتح اپنی سرفروشیوں اور جانشنازوں کے سارے شراث اس کے قدموں میں لا کر رکھ دے اور اس کو امام مان کر خود مقتدری بنا قبول کر لے۔ یہ گروہ جب اپنی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے اصولوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے، اس کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح فریقین میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ مگر اس کشمکش میں جتنی شدت بڑھتی جاتی ہے، یہ گروہ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں اتنے ہی زیادہ افضل و اشرف اخلاق کا ثبوت دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ واقعی و خلق اللہ کی بھلائی کے سوا کوئی دوسری غرض پیش نظر نہیں رکھتا۔ اس کی دشمنی اپنے مخالفوں کی ذات یا قومیت سے نہیں بلکہ صرف اُن کی مظلالت و گمراہی سے ہے، جسے وہ چھوڑ دیں تو وہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو

بھی سینے سے لگا سکتا ہے۔ اسے لائقِ اُن کے مال و دولت یا ان کی تجارت و صنعت کا نہیں بلکہ خود اُنہی کی اخلاقی اور روحانی فلاح کا ہے، جو حاصل ہو جائے تو اُن کی دولت اُنھیں کو مبارک رہے۔ وہ خحت سے سخت آزمائش کے موقعوں پر بھی جھوٹ، دغا اور مکروہ فریب سے کام نہیں لیتا۔ ٹیڑھی چالوں کا جواب بھی سیدھی تدبیروں سے دیتا ہے۔ انتقام کے جوش میں بھی ظلم و زیادتی پر آمادہ نہیں ہوتا، جنگ کے ختح لمحوں میں بھی اپنے اُن اصولوں کی پیروی نہیں چھوڑتا، جن کی دعوت دینے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ سچائی، وقارے عہد اور حسن معاملت پر ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ بے لاغ انصاف کرتا ہے اور امانت و دیانت کے اُس معیار پر پورا اترتا ہے، جسے ابتداءً اس نے دنیا کے سامنے معیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ مخالفین کی زانی، شرابی، جواری اور سُنگ دل و بے رحم فوجوں سے جب اس گروہ کے خدا ترس، پاک باز، عبادت گزار، نیک دل اور رحیم و کریم مجاہدوں کا مقابلہ پیش آتا ہے تو فرد افراد اُن کی انسانیت اُن کی درندگی و حیوانیت پر فاقہ نظر آتی ہے۔ وہ اُن کے پاس رنجی یا قیدی ہو کر آتے ہیں تو یہاں ہر طرف نیکی، شرافت اور پاکیزگی اخلاق کا ماحول دیکھ کر اُن کی آسودہ نجاست رو جیں بھی پاک ہونے لگتی ہیں۔ اور یہاں گرفتار ہو کر جاتے ہیں تو اُن کا جو ہر انسانیت اس تاریک ماحول میں اور زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ اُن کو کسی علاقے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو مفتوح آبادی کو انتقام کی جگہ عفو، ظلم و جور کی جگہ رحم و انصاف، شقاوتوں کی جگہ ہمدردی، تکبر و نخوت کی جگہ حلم و تواضع، گالیوں کی جگہ دعوت خیر، جھوٹ پر و پیکنڈوں کی جگہ اصول حق کی تبلیغ کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر عرش کرنے لگتے ہیں کہ فاتح سپاہی نہ ان سے عورتیں مانگتے ہیں، نہ دبے چھپے مال مٹو لئے پھرتے ہیں، نہ ان کے صنعتی رازوں کا سرا غلگاتے ہیں، محضان کی معاشی طاقت کو کچلنے کی فکر کرتے ہیں، نہ اُن کی قومی عزت کو ٹھوکر مارتے ہیں، بلکہ اُنہیں اگر کچھ فکر ہے تو یہ کہ جو ملک اب ان کے چارچ میں ہے اس کے باشندوں میں سے کسی کی عصمت خراب نہ ہو، کسی کے مال کو نقصان نہ پہنچ، کوئی اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہو، کوئی بداخلی اُن کے درمیان پرورش نہ پاسکے اور اجتماعی ظلم و جور کی شکل میں بھی وہاں باقی نہ رہے۔ بخلاف اس کے جب فریق خالف کسی علاقے میں گھس آتا ہے تو ساری آبادی اُس کی زیادتیوں اور بے رحمیوں سے چیخ اٹھتی ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ ایسی لڑائی میں قوم پرستانہ لڑائیوں کی بہ نسبت کتنا بڑا فرق واقع ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقابلے میں بالآخر انسانیت

کمتر مادی سروسامان کے باوجود اپنے مخالفوں کی آہن پوش حیوانیت کو آخراً کارٹنگ دے کر رہے ہیں۔ اخلاقی فاضلہ کے ہتھیار توپ و ٹنگ سے زیادہ دور مار ثابت ہوں گے۔ میں حالت جنگ میں دشمن دوستوں میں تبدیل ہوں گے۔ جسموں سے پہلے دل مسخر ہوں گے۔ آبادیوں کی آبادیاں لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہو جائیں گی اور یہ صالح گروہ جب ایک مرتبہ مٹھی بھر جمعیت اور ٹھوڑے سے سروسامان کے ساتھ اپنا کام شروع کر دے گا تو رفتہ رفتہ خود خلاف یکمپ ہی سے اس کو جزل، سپاہی، ماہرینِ فنون، اسلحہ، رسید، سامانِ جنگ سب کچھ حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ زرا قیاس اور اندازہ نہیں ہے بلکہ اگر آپ کے سامنے نبی اور خلفاء راشدینؓ کے دورِ مبارک کی تاریخی مثال موجود ہو تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ فی الواقع اس سے پہلے یہی کچھ ہو چکا ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے، بشرطے کہ کسی میں یہ تجربہ کرنے کی ہمت ہو۔

حضرات! مجھے توقع ہے کہ اس تقریر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن نشیں ہو گئی ہو گی کہ طاقت کا اصل منبع اخلاقی طاقت ہے۔ اگر دنیا میں کوئی متفقلم گروہ ایسا موجود ہو، جو بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات کا زور بھی اپنے اندر رکھتا ہو اور مادی وسائل سے بھی کام لے تو یہ بات عقولاً محال اور فطرتاً غیر ممکن ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ اس کے ساتھ مجھے امید ہے کہ آپ نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ نہ مادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی اخلاقیات سے آرستہ ہوں اور نہ اجتماعی طور پر ان کے اندر اسلامی اخلاقیات ہی پائے جائیں، وہ کسی طرح بھی امامت کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتے۔ خدا کی اہل بے لائق سنت کا تقاضا یہی ہے کہ ان پر ایسے کافروں کو ترجیح دی جائے، جو اسلامی اخلاقیات سے عاری ہیں مگر کم از کم بنیادی اخلاقیات اور مادی وسائل کے استعمال میں تو ان سے بڑھے ہوئے ہیں، اور اپنے آپ کو ان کی بہ نسبت انتظام دنیا کے لیے اہل تراثت کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ کو کوئی شکایت ہو تو سنت اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہونی چاہیے اور اس شکایت کا تیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اب اپنی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کریں، جس نے آپ کو امام سے مقدمی اور پیش رو سے پس روانا کر چھوڑا ہے۔

اس کے بعد ضرورت ہے کہ میں صاف اور واضح طریقے سے آپ کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں کو بھی پیش کر دوں، کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ اس معاملے میں عام طور پر مسلمانوں کے تصورات بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ اس الجھن کی وجہ سے بہت ہی کم آدمی یہ جانتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات فی الواقع کس چیز کا نام ہے اور اس پہلو سے انسان کی تربیت و تکمیل کے لیے کیا چیزیں کس ترتیب و ترتیج کے ساتھ اس کے اندر پرورش کی جانی چاہیں۔

اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب

جس چیز کو ہم اسلامی اخلاقیات سے تعبیر کرتے ہیں وہ قرآن و حدیث کی رو سے دراصل چار مراتب پر مشتمل ہے: ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان یہ چاروں مراتب یکے بعد دیگرے اس فطری ترتیب پر واقع ہیں کہ ہر بعد کا مرتبہ پہلے مرتبے سے پیدا اور لازماً اسی پرقائم ہوتا ہے اور جب تک یہ نیچے والی منزل پختہ و محکم نہ ہو جائے دوسرا منزل کی تغیر کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ اس پوری عمارت میں ایمان کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بنیاد پر اسلام کی منزل تغیر ہوتی ہے پھر اس کے اوپر تقویٰ اور سب سے اوپر احسان کی منزلیں اٹھتی ہیں۔ ایمان نہ ہو تو اسلام و تقویٰ یا احسان کا سرے سے کوئی امکان نہیں۔ ایمان کم زور ہو تو اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جاسکتا ایسی کوئی منزل تغیر کر بھی دی جائے تو وہ بودی اور منزل ہوگی۔ ایمان محدود ہو تو جتنے حدود میں وہ محدود ہو گا اسلام، تقویٰ اور احسان بھی بس انھی حدود تک محدود رہیں گے۔ پس جب تک ایمان پوری طرح صحیح، پختہ اور وسیع نہ ہو، کوئی مرد عاقل جو دین کا فہم رکھتا ہو اسلام، تقویٰ یا احسان کی تغیر کا خیال نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تقویٰ سے پہلے اسلام اور احسان سے پہلے تقویٰ کی صحیح، پختگی اور توسعہ ضروری ہے۔ لیکن اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس فطری و اصولی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایمان و اسلام کی تکمیل کے بغیر تقویٰ و احسان کی باقاعدہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک یہ ہے کہ بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایمان و اسلام کا ایک نہایت محدود تصور جا گزیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ محض وضع قطعہ، بیاس، نشت و برخاست، اکل و شرب اور ایسی ہی چند ظاہری چیزوں کو ایک مقرر نقشے پر ڈھال لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے، اور پھر عبادات میں نوافل واذکار، اور اد و ظاائف اور ایسے ہی بعض اعمال اختیار

کر لینے سے احسان کا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ بنا اوقات اسی "تقویٰ" اور "احسان" کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں میں ایسی صریح علامات بھی نظر آتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان کا ایمان ہی سرے سے درست اور پہنچنے نہیں ہوا ہے۔ یہ غلطیاں جب تک موجود ہیں کسی طرح یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ ہم اسلامی اخلاقیات کا نصاب پورا کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ہمیں ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کے ان چاروں مراتب کا پورا پورا تصور بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہم ان کی فطری ترتیب کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

ایمان

اس سلسلے میں سب سے پہلے ایمان کو بیجیے، جو اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تو حیدور سالت کے اقرار کا نام ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا اقرار کر لے تو اس سے وہ قانونی شرط پوری ہو جاتی ہے، جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے رکھی گئی ہے اور وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سامعاملہ کیا جائے۔ مگر کیا یہی سادہ اقرار، جو ایک قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی ہے، اس غرض کے لیے بھی کافی ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کی ساری سہ منزلہ عمارت صرف اسی بنیاد پر قائم ہو سکے؟ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی لیے جہاں یہ اقرار موجود ہوتا ہے وہاں عملی اسلام اور تقویٰ اور احسان کی تعمیر شروع کر دی جاتی ہے، جو اکثر ہوائی قلعے سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن فی الواقع ایک مکمل اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایمان اپنی تفصیلات میں پوری طرح وسیع اور اپنی گہرائی میں اچھی طرح مستحکم ہو۔ ایمان کی تفصیلات میں سے، جو شعبۂ بھی چھوٹ جائے گا، اسلامی زندگی کا وہی شعبۂ تعمیر ہونے سے رہ جائے گا اور اس کی گہرائی میں جہاں بھی کسر رہ جائے گی اسلامی زندگی کی عمارت اسی مقام پر بودی ثابت ہوگی۔

مثال کے طور پر ایمان باللہ کو دیکھیے، جو دین کی اولین بنیاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ خدا کا اقرار اپنی سادہ صورت سے گزر کر جب تفصیلات میں پہنچتا ہے تو لوگوں کے ذہن میں اس کی بے شمار صورتیں بن جاتی ہیں۔ کہیں وہ صرف اس حد پر ختم ہو جاتا ہے کہ بے شک خدا موجود ہے اور دنیا کا خالق ہے اور اپنی ذات میں اکیلا ہے، کہیں اس کی انتہائی وسعت بس اتنی ہوتی ہے

کہ خدا ہمارا معمود ہے اور ہمیں اس کی پرستش کرنی چاہیے۔ کہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کا تصور کچھ زیادہ وسیع ہو کر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ عالم الغیب، سمیع و بصیر، سمیع الدعوات و قاضی الحاجات اور ”پرستش“ کی تمام جزوی شکلوں کا مستحق ہونے میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اور یہ کہ ”زمہنی معاملات“ میں آخری سند خدا ہی کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مختلف تصورات سے ایک ہی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی، بلکہ جو تصور جتنا محدود ہے عملی زندگی اور اخلاق میں بھی لازماً اسلامی رنگ اتنا ہی محدود ہو گا، حتیٰ کہ جہاں عام مذہبی تصورات کے مطابق ایمان باللہ اپنی انہائی وسعت پر پہنچ جائے گا وہاں بھی اسلامی زندگی اس سے آگئے بڑھ سکتی کہ خدا کے باغیوں کی وفاداری اور خدا کی وفاداری ایک ساتھ نباہی جائے، یا نظامِ کفر اور نظامِ اسلام کو سموکر ایک مرکب بنالیا جائے۔

اسی طرح ایمان باللہ کی گہرائی کا پیانہ بھی مختلف ہے۔ کوئی خدا کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی کسی معمولی سے معمولی چیز کو بھی خدا پر قربان کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ کوئی بعض چیزوں سے خدا کو عزیز تر رکھتا ہے مگر بعض چیزوں اسے خدا سے عزیز تر ہوتی ہیں۔ کوئی اپنی جان مال تک خدا پر قربان کر دیتا ہے مگر اپنے رجحاناتِ نفس اور اپنے نظریات و افکار کی قربانی یا اپنی شہرت کی قربانی اسے گوارا نہیں ہوتی۔ تھیک تھیک اسی تناسب سے اسلامی زندگی کی پاسیداری و ناپاسیداری بھی متعین ہوتی ہے اور انسان کا اسلامی اخلاق تھیک اسی مقام پر دعادے جاتا ہے جہاں اس کے نیچے ایمان کی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے۔

ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اسی اقرار اور توحید پر اٹھ سکتی ہے، جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو، جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے۔ اس کو اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معمود، مطاع اور صاحب امر و نبی تسلیم کرے۔ اسی کوہدایت کا سرچشمہ مانے اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے اخراج، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی، یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے۔ پھر اس عمارت میں اگر استحکام پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اسی وقت جب کہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فصلہ کرے کہ وہ اور اس کا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کے لیے

ہے۔ اپنے معیار پسند و ناپسند کو ختم کر کے اللہ کی پسند و ناپسند کے تابع کر دے۔ اپنی خودسری کو مٹا کر اپنے نظریات و خیالات، خواہشات، جذبات اور انداز فکر کو اس علم کے مطابق ڈھال لے، جو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اپنی تمام اُن وفاداریوں کو دریا برد کر دے، جو خدا کی وفاداری کے تابع نہ ہوں بلکہ اس کے مقابل بنی ہوئی ہوں یا بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بھائے، اور ہر اس بہت کو ڈھونڈ کر اپنے نہاں خانہ دل سے نکال پھیکے، جو خدا کے مقابلے میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔ اپنی محبت اور نفرت، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی رغبت اور کراہیت، اپنی صلح اور جنگ ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کر دے کہ اس کا نفس وہی چاہنے لگے، جو خدا چاہتا ہے اور اسی سے بھاگنے لگے، جو خدا کو ناپسند ہے۔ یہ ہے ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ گیری اور اپنی پیشگی و مضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقویٰ یا احسان کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ کیا اس نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا سمجھ گردانی و تہجد خوانی سے پوری کی جاسکتی ہے۔

اسی پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کر لیجیے۔ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان کا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنارہنمائی مان لے اور اس کی رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہوں اُن کو رد نہ کر دے۔ کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصول زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شاہد بھی باقی ہو یا ایجاد عما نازل اللہ کو اپنی اور ساری دنیا کی زندگی کا قانون دیکھنے کے لیے قلب و روح کی بے چینی میں کچھ بھی کسر ہو۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دنیا پر ترجیح دیئے اور اخروی قدروں کے مقابلے میں دنیوی قدروں کو ٹھکرایا دیئے پر آمادہ نہ ہو جائے اور آخرت کی جواب دہی کا خیال اسے زندگی کی ہر راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر ٹھکنے نہ لگے۔ یہ بنیادیں ہی جہاں پوری نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالی شان عمارت کس شے پر تعمیر ہوگی؟ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسعہ و تکمیل اور پیشگی کے بغیر تعمیر اخلاق اسلامی کو ممکن سمجھا، تب ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرنے والے نج، غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمے لڑانے

والے وکیل، نظام کفر کے مطابق معاملاتِ زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن، کافرانہ اصولِ تمدن و ریاست پر زندگی کی تفہیم و تاسیس کے لیے لڑانے والے لیڈر اور پیر و غرض سب کے لیے تقویٰ و احسان کے مراتبِ عالیہ کا دروازہ کھل گیا، بشر طے کردہ اپنی زندگی کے ظاہری انداز و اطوار کو ایک خاص نقشہ پر ڈھال لیں اور کچھ نوافل واذ کار کی عادت ڈال لیں۔

اسلام

ایمان کی یہ بنیادیں، جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، جب کمل اور گھری ہو جاتی ہیں، تب ان پر اسلام کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اسلام دراصل ایمان کے عملی ظہور کا درسرا نام ہے۔ ایمان اور اسلام کا باہمی تعلق دیا ہی ہے جیسا بیچ اور درخت کا تعلق ہوتا ہے۔ بیچ میں جو کچھ اور جیسا کچھ موجود ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ درخت کا امتحان کر کے بہ آسانی یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ بیچ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ آپ نہ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ بیچ نہ ہو اور درخت موجود ہو، اور نہ یہی تصور کر سکتے ہیں کہ زمین بخوبی نہ ہو اور بیچ اس میں موجود بھی ہو، پھر بھی درخت پیدا نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ ایمان اور اسلام کا ہے۔ جہاں ایمان موجود ہوگا، لازماً اس کا ظہور آدمی کی عملی زندگی میں، اخلاق میں، برناوی میں، تعلقات کے کٹنے اور جڑنے میں، دوڑ دھوپ کے رخ میں، مذاق و مزاج کی افتاد میں، سعی و جهد کے راستوں میں، اوقات اور قتوں اور قابلیتوں کے مصرف میں، غرض مظاہر زندگی کے ہر جزو میں ہو کر رہے گا۔ ان میں سے جس پہلو میں بھی اسلام کے بجائے غیر اسلام ظاہر ہو رہا ہو، یقین کر لیجیے کہ اس پہلو میں ایمان موجود نہیں ہے یا ہے تو بالکل بودا اور بے جان ہے اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری ہی غیر مسلمانہ شان سے بس ہو رہی ہو، تو جان لیجیے کہ دل ایمان سے خالی ہے۔ زمین اتنی بخوبی ہے کہ ایمان کا بیچ برگ و پار نہیں لارہا ہے۔ بہر حال میں نے جہاں تک قرآن و حدیث کو سمجھا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دل میں ایمان ہو اور عمل میں اسلام نہ ہو۔

(اس موقعے پر ایک صاحب نے اٹھ کر پوچھا کہ ایمان و عمل کو آپ ایک ہی چیز

سمجھتے ہیں یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے؟ اس کے جواب میں کہا)

آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذہن سے ان بحثوں کو نکال دیں، جو فقہاء اور متكلمین

نے اس مسئلے میں کی ہیں اور قرآن سے اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اعتقادی ایمان اور عملی اسلام لازم و ملزم ہیں۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ایمان اور عمل صاحب کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے اور تمام اچھے وعدے، جو اس نے اپنے بندوں سے کیے ہیں انھی لوگوں سے متعلق ہیں، جو اعتقاد اُمور میں اور عمل اسلام ہوں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں منافقین کو پکڑا ہے وہاں ان کے عمل ہی کی خرابیوں سے ان کے ایمان کے نقش پر دلیل قائم کی ہے اور عملی اسلام ہی کو حقیقی ایمان کی علامت تھیسا رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قانونی لحاظ سے کسی شخص کو فائز تھیرانے اور امت سے اس کا رشتہ کاٹ دینے کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں انتہائی احتیاط لحوظہ زندگی چاہیے۔ گریٹ میں یہاں اُس ایمان و اسلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، جس پر دنیا میں فقہی احکام مترب ہوتے ہیں، بلکہ یہاں ذکر اُس ایمان و اسلام کا ہے، جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس پر اخروی نتائج مترب ہونے والے ہیں۔ قانونی نقطہ نظر کو چھوڑ کر حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے اگر آپ دیکھیں گے تو یقیناً یہی پائیں گے کہ جہاں عمل خدا کے آگے سپر اندازی اور پر درگی و حوالگی میں کمی ہے، جہاں نفس کی پسند خدا کی پسند سے مختلف ہے، جہاں خدا کی وفاداری کے ساتھ غیر کی وفاداری نہ رہی ہے، جہاں خدا کا دین قائم کرنے کی سعی کے بجائے دوسرے مشاغل میں انشاہک ہے، جہاں کوششیں اور محنتیں را خدا کے بجائے دوسری را ہوں میں صرف ہو رہی ہیں، وہاں ضرور ایمان میں نقش ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تلاش ایمان پر تقویٰ اور احسان کی تحریر نہیں ہو سکتی، خواہ ظاہر کے اعتبار سے متفقیوں کی سی وضع بنانے اور محسینین کے سے بعض اعمال کی نقل اتنا نے کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔ ظاہر فریب شکلیں اگر حقیقت کی روح سے خالی ہوں تو ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے، جیسی ایک نہایت خوب صورت آدمی کی لاش بہترین وضع و بیست میں موجود ہو مگر اس میں جان نہ ہو۔ اس خوب صورت لاش کی ظاہری شان سے دھوکا کھا کر آپ اگر کچھ توقعات اس سے وابستہ کر لیں گے تو واقعات کی دنیا اپنے پہلے ہی امتحان میں اس کا ناکارہ ہونا ثابت کر دے گی اور تاجر بے سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک بد صورت مگر زندہ انسان ایک خوب صورت مگر بے روح لاش سے بہر حال زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ ظاہر فریبیوں سے آپ اپنے نفس کو تو ضرور دھوکا دے سکتے ہیں۔ لیکن عالم واقع پر کچھ بھی اثر نہیں ڈال سکتے اور نہ خدا کی میران ہی میں کوئی وزن حاصل کر سکتے ہیں۔ پس اگر آپ کو ظاہری

نہیں بلکہ وہ حقیقی تقویٰ اور احسان مطلوب ہو، جو دنیا میں دین کا بول بالا کرنے اور آخرت میں خیر کا پڑا جھکانے کے لئے درکار ہے تو میری اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اور پر کی یہ دونوں منزليں کبھی نہیں اٹھ سکتیں جب تک ایمان کی بنیاد مصبوط نہ ہو جائے اور اس کی مضبوطی کا ثبوت عملی اسلام یعنی بالفعل اطاعت و فرمان برداری سے نہل جائے۔

تقویٰ

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ تقویٰ ہے کیا چیز۔ تقویٰ حقیقت میں کسی وضع و بیعت اور کسی خاص طرزِ معاشرت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل وہ نفس کی اُس کیفیت کا نام ہے، جو خدا ترسی اور احساسِ ذمے داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ عبدیت کا شعور ہو۔ خدا کے سامنے اپنی ذمے داری و جواب وہی کا احساس ہو۔ اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مهلتِ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مقابلہ بالکل اس چیز پر محصر ہے کہ میں اس دیے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتیں وقابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اس سروسامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں، جو مشیتِ الہی کے تحت مجھے دیا گیا ہے، اور ان انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں، جن سے قضاۓ الہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کر دی ہے۔ یہ احساس و شعور جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے اُس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی دینی حس تیز ہو جاتی ہے۔ اس کو وہ ہر چیز کھلنے لگتا ہے، جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔ وہ اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہے کہ میرے اندر کس قسم کے رجحانات و میلانات پرورش پار ہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود معاسبة کرنے لگتا ہے کہ میں کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کر رہا ہوں۔ وہ صریح ممنوعات تو درکنار مشتبہ امور میں بھی بتلا ہوتے ہوئے خود بہ خود حمکنے لگتا ہے۔ اس کا احساس فرض اسے مجبور کر دیتا ہے کہ تمام اور کوپوری فرماں برداری کے ساتھ بجالائے۔ اس کی خدا ترسی ہر اس موقعے پر اس کے قدم میں لرزش پیدا کر دیتی ہے جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندر یشہ ہو۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت آپ سے آپ اس کا وظیرہ بن جاتی ہے اور اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کا پ انتہا

ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرہ میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرزِ فکر اور اس کے تمام کارنامہ زندگی میں اس کا ظہور ہوتا ہے، اور اس کے اثر سے ایک ایسی ہموار و یک رنگ سیرت پیدا ہوتی ہے، جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی و صفائی پائیں گے۔ بخلاف اس کے چہار تقویٰ بس اس چیز کا نام رکھ لیا گیا ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کر لے اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لے، جس کی پیمائش کی جاسکتی ہو، وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ چند اشکالی تقویٰ، جو سکھادی گئی ہیں، ان کی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہے، مگر اس کے ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرزِ فکر اور وہ طرزِ عمل بھی ظاہر ہو رہے ہیں، جو مقام تقویٰ تو در کنار، ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسب نہیں رکھتے۔ یعنی حضرت مسیح کی تمثیلی زبان میں ممحنر چھانے جا رہے ہیں اور اونٹ پر تکلفی کے ساتھ لگے جا رہے ہیں۔

حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کے اس فرق کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص تو وہ ہے، جس کے اندر طہارت و نظافت کی حس موجود ہے اور پاکیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے۔ ایسا شخص گندگی سے فی نفسہ نفرت کرے گا خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو، اور طہارت کو بجاۓ خود اختیار کر لے گا خواہ اس کے مظاہر کا احاطہ نہ ہو سکتا ہو۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے، جس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں ہے مگر وہ گندگیوں اور طہارتوں کی ایک فہرست لیے پھرتا ہے، جو کہیں سے اس نے نقل کر لی ہیں۔ یہ شخص ان گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا، جو اس نے فہرست میں لکھی ہوئی پائی ہیں، مگر بے شمار ایسی گھناوی چیزوں میں آلوہ پایا جائے گا، جو ان گندگیوں سے بدر جہا زیادہ ناپاک ہوں گی، جن سے وہ نجح رہا ہے، صرف اس وجہ سے کہ وہ اس فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں، یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں، جن کے تقویٰ کی دھوم پچی ہوئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں جزئیاتِ شرع کا یہ اہتمام ہے کہ ڈاڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فشق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے۔ پانچ تین سے ذرا سیچے ہو جائے تو جنم کی وعید سنادی جاتی ہے۔ اپنے مسلکِ فقہی کے فروعی احکام سے ہٹانا ان کے نزد یک گویا دین سے

نکل جانا ہے۔ لیکن دوسری طرف دین کے اصول و کلیات سے اُن کی غفلت اس حد کو پچھی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انہوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے۔ اقامتِ دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں انہوں نے نکال رکھی ہیں۔ علماء کفر کے تحت ”اسلامی زندگی“ کے نقشے بنانے ہی میں اُن کی ساری محنتیں اور کوششیں صرف ہو رہی ہیں۔ اور انہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک مددود دائرے میں مذہبی زندگی بسر کر کے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کر سکتے ہیں، اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں ہے، جس کے لیے وہ سعی کریں۔ پھر اس سے بھی زیادہ انسوس ناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامتِ دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات سعی اُن سنی کر دیتے ہیں، بلکہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے، جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی ان کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا ہے کہ ان کے تقویٰ میں کوئی کسر ہے۔ اسی طرح حقیقی اور مصنوعی تقویٰ کا فرق بے شمار شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مگر آپ اسے تب ہی محسوس کر سکتے ہیں کہ تقویٰ کا اصلی تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وضع قطع، لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق، جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں میں اُن کا اتحاف کرنا چاہتا ہوں یا انھیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نہیں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل شے حقیقت تقویٰ ہے نہ کہ یہ ظاہر۔ حقیقت تقویٰ جس کے اندر پیدا ہوگی اس کی پوری زندگی ہمواری و یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بنے گی۔ اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اس کے خیالات میں، اس کے جذبات و رحمات میں، اس کے مذاق طبیعت میں، اس کے اوقات کی تقسیم اور اس کی قوتیں کے مصارف میں، اس کی سعی کی راہوں میں، اس کے طرزِ زندگی اور معاشرت میں، اس کی کمالی اور خرچ میں، غرض اس کی حیات دنیوی کے سارے ہی پہلوؤں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ظاہر کو حقیقت پر مقدم رکھا جائے گا اور ان پر بیجا زور دیا جائے گا اور حقیقی

تقویٰ کی تحریک ریزی اور آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کر ادی جائے گی، تو نتائج وہی کچھ ہوں گے، جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزمائش ہے، بتدریج نشوونما پاتی اور ایک مدت کے بعد برگ و بارلاٹی ہے، جس طرح شیخ سے درخت کے پیدا ہوئے اور پھل پھول لانے میں کافی دیرگا کرتی ہے۔ اسی لیے سطحی مزاج کے لوگ اس سے اپر آتے ہیں۔ بخلاف اس کے دوسرا چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کر لی جاتی ہے، جیسے ایک لکڑی میں پتے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنادی جائے۔ پہی وجہ ہے کہ تقویٰ کی پیداوار کا یہی ڈھنگ آج مقبول ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے تو کمی پوری نہیں ہو سکتیں۔

احسان

اب احسان کو بیجیے، جو اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔ احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ اُس قبیلہ کا ہے، اس گھری محبت، اُس پچی و فاداری اور ندویت و جاں ثاری کا نام ہے، جو مسلمان کو فنا فی الاسلام کر دے۔ تقویٰ کا اساسی تصور خدا کا خوف ہے، جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا اساسی تصور خدا کی محبت ہے، جو آدمی کو اس کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے ابھارے۔ ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں، جو نہایت فرض شناسی و تن دہی سے وہ تمام خدمات ٹھیک ٹھیک بجالاتے ہیں، جو ان کے پر دکی گئی ہوں۔ تمام ضالبویں اور قاعدوں کی پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی کام ایسا نہیں کرتے، جو حکومت کے لیے قبل اعتراض ہو۔ دوسرا بقہ اُن مخلص و فاداروں اور جان ثاروں کا ہوتا ہے، جو دل و جان سے حکومت کے ہوا خواہ ہوتے ہیں۔ صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے، جو ان کے پر دکی گئی ہوں، بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ یہ فکر لگتی رہتی ہے کہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح ترقی دی جائے اس دھن میں وہ فرض اور مطالبہ سے زائد کام کرتے ہیں۔ سلطنت پر کوئی آنچھ آئے تو وہ جان و مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو اُن کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ کہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور

اسے فروکرنے میں جان لڑا دیتے ہیں۔ جان بوجھ کر خود سلطنت کو نقصان پہنچانا تو درکنار اس کے مقابل کو کسی طرح نقصان پہنچتے دیکھنا بھی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے اور اس خرابی کے رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دقیقتہ اٹھانبیں رکھتے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں بس ان کی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی چپا ایسا باقی نہ رہے جہاں اس کا پھریرانہ اڑے۔ ان دونوں میں سے پہلی قسم کے لوگ اس حکومت کے مقیٰ ہوتے ہیں اور دوسرا سی قسم کے لوگ اس کے محسن۔ اگرچہ ترقیات متقین کو بھی ملتی ہیں اور بہر حال ان کے نام اچھے ہی ملازموں کو فہرست میں لکھتے جاتے ہیں مگر جو سرفرازیاں محسین کے لیے ہیں ان میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہوتا۔ بس اسی مثال پر اسلام کے متقین اور محسنوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ اگرچہ متقین بھی قابل قدر اور قابل اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصلی طاقت محسین کا گروہ ہے۔ اصلی کام جو اسلام چاہتا ہے کہ دنیا میں ہو وہ اسی گروہ سے بن آ سکتا ہے۔

احسان کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو فر سے مغلوب دیکھیں، جن کے سامنے خدواللہ پامال ہی نہیں بلکہ کا عدم کردی جائیں، خدا کا قانون عملًا ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کر دیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو، نظام کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی و تمدنی فساد برپا ہو بلکہ خود امت مسلمہ بھی نہایت سرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو، اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو، نہ اس حالت کو بد لئے کے لیے کوئی جذبہ بھڑکے، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبے پر اصولاً و عملًا مطمئن کر دیں، ان کا شمار آخزمحسین میں کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس جرم عظیم کے ساتھ مغض یہ بات انھیں احسان کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تجدی کی نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مرائبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیات نقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور ترکیہ نفس کی خانقاہوں میں دین داری کا وہ فن سکھاتے رہے، جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دین داری، جو ”سردار نداد دست در دست زیزد“ کی کیفیت پیدا کرے اور ”بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھوسکا“

کے مقام وفاداری پر پہنچا دے۔ آپ دنیوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفادار کی اتنی تمیز ضرور نہیاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہو جائے یا ملک کے کسی حصے پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو باغیوں اور دشمنوں کے تسلط کو جو لوگ جائز تسلیم کر لیں یا ان کے تسلط پر راضی ہو جائیں اور ان کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کر لیں، یا ان کی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں، جس میں اصلی اقتدار کی بائیں انھی کے ہاتھ میں رہیں اور کچھ منی حقوق اور اختیارات انھیں بھی مل جائیں، تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار مانے کے لیے تیار نہیں ہوتی، خواہ وہ قوی فیشن کے لیے ہی خخت پابند اور جزوی معاملات میں قومی قانون کے کتنے ہی شدید بیروہوں۔ آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں وہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے، جنہوں نے جرمن قبضے کے زمانے میں تعاون و مصالحت کی راہیں اختیار کی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کو جا پہنچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص نے دشمن کے تسلط کی مراحت کس حد تک کی، اس کو منانے کے لیے کیا کام کیا اور اس اقتدار کو واپس لانے کی کیا کوشش کی، جس کی وفاداری کا وہ مرعی تھا، پھر کیا معاذ اللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کو پہنچانے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا، جتنی دنیا کے ان کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس ڈاڑھیوں کا طول، بخنوں اور پاچھوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش اور ادو و طائف اور نوافل اور مراتبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکا کھا جائے گا کہ آپ اس کے سچے وفادار اور جاں ثمار ہیں؟

غلط فہمیاں

حضرات! اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا۔ عام مسلمانوں کے ذہن پر متوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و ظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دین داری و اخلاقی اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے، مگر لوگوں کے دماغ ہر پھر کر انھی چھوٹے چھوٹے سائل اور ذرا ذرا سی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جاتی ہیں، جنھیں اصل دین بنانا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وباۓ عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقا اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میں اپنا پورا ذور یہ

سمجھانے میں صرف کرتا رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے، اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے، اور اس میں مقدم کیا ہے اور موخر کیا ہے۔ لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروع کی اہمیت داغنوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرا رہو رہی ہے، جن میں سارا مطالبہ بس اس کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی ڈاڑھیاں بڑھوائی جائیں، پانچ ٹخنوں سے اوپنجے کرائے جائیں اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انھیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کوہ ”روحانیت“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر شاید وہ غوښہیں بتا سکتے کہ یہ روحانیت فی الواقع ہے کیا شے۔ اسی بنا پر ان کی رائے یہ ہے کہ نصب اعین اور طریق کا رتو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور ترکیہ نفس اور تربیت روحانی کے لیے خانقاہوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو شریع کر چکا ہوں اُس میں اگر کوئی چیز قرآن و حدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اس کی نشان دہی فرمادیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی رو سے ہمیں ان چار چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچیے کہ جہاں ایمان کی مقتضیات بھی پوری طرح متحقّق نہ ہوں، اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو، وہاں آخر کون سی روحانیت پائی جاسکتی ہے، جسے آپ تلاش کرنے جارہے ہیں۔ رہے وہ جزئیات شرع، جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر کھا ہے تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کیے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی ذمے داری سے سبک دوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے محدثے دل سے اس سوال پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کے لیے بھیجے ہیں؟ دنیا میں آخر کس چیز کی تھی؟ کیا خرابی پائی جاتی تھی، جسے رفع کرنے کے لیے انبیاء مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا وہ تیہی کہ لوگ ڈاڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انھی کے رکھانے کے لیے رسول بھیجے گئے؟ یا یہ کہ لوگ ٹھنے ڈھانکے رہتے تھے اور انہیاء کے ذریعے سے انھیں کھلوانا مقصود تھا؟ یا وہ چند سنیتیں، جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت

چ چاہے، دنیا میں جاری کرنے کے لیے انبیاء کی ضرورت تھی؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ اصل خرابیاں کیا تھیں، جنہیں دور کرنا مطلوب تھا اور وہ حقیقی بھلاکیاں کیا تھیں، جنہیں قائم کرنے کی ضرورت تھی؟ اس کا جواب آپ اس کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں کہ خداۓ واحد کی اطاعت و بنیادی سے انحراف، خود ساختہ اصول و قوانین کی پیروی اور خدا کے سامنے ذمے داری و جواب دہی کا عدم احساس، تھیں وہ اصل خرابیاں، جو دنیا میں رونما ہوئی تھیں۔ انہی کی بدولت اخلاق فاسدہ پیدا ہوئے، غلط اصول زندگی راجح ہوئے اور زمین میں فساد برپا ہوا۔ پھر ان بیانات علیہم السلام اس غرض کے لیے بھیجے گئے کہ انسانوں میں خدا کی بنیادی و قادری اور اس کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس پیدا کیا جائے، اخلاقی فاضلہ کو نشوونما دیا جائے اور انسانی زندگی کا نظام اُن اصولوں پر قائم کیا جائے، جن سے خیر و صلاح ابھرے اور شر و فساد دے۔ یہی ایک مقصد تما مام انبیاء کی بعثت کا تھا اور آخرا کاری مقصد کے لیے محمد ﷺ معمول ہوئے۔

اب دیکھیے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محمد ﷺ نے کس ترتیب و مرتبہ کے ساتھ کام کیا۔ سب سے پہلے آپ نے ایمان کی دعوت دی اور اس کو وسیع ترین بنیادوں پر پختہ و مشتمل فرمایا۔ پھر اس ایمان کے مقتضیات کے مطابق بذریعۃ اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے الٰی ایمان میں عملی اطاعت و فرمان برداری (اسلام)، اخلاقی طہارت (تقویٰ) اور خدا کی گہری محبت و وفاداری (احسان) کے اوصاف پیدا کیے۔ پھر ان مختلف مونوں کی منظمی و جہد سے قدیم جاہلیت کے فاسد نظام کو مٹایا اور اس کی جگہ قانونِ خداوندی کے اخلاقی و تمدنی اصولوں پر ایک نظام صاف قائم کر دیا۔ اس طرح جب یہ لوگ اپنے دل و دماغ، نفس و اخلاق، انکار و اعمال، غرض جملہ حیثیات سے واقعی مسلم، متقی اور حسن بن گئے اور اس کام میں لگ گئے، جو اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کرنا چاہیے تھا، تب آپ نے ان کو بتانا شروع کیا کہ وضع قطع، لباس، کھانے پینے، رہنہ سہنے، اٹھنے میٹھنے اور دوسرا ٹھہری بر تاؤ میں وہ مہذب آداب و اطوار کوں سے ہیں، جو متقیوں کو زیب دیتے ہیں۔ گویا پہلے صحنِ خام کو کندن بنایا پھر اس پر اشرفتی کا شپہ لگایا۔ پہلے سپاہی تیار کیے پھر انھیں وردی پہنائی۔ یہی اس کام کی صحیح ترتیب ہے، جو قرآن و حدیث کے غائر مطالعے سے صاف نظر آتی ہے۔ اگر ابتداء سنت نام ہے اس طرزِ عمل کا، جو نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی مرضی

پوری کرنے کے لیے بدایت الہی کے تحت اختیار کیا تھا، تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی ہے کہ حقیقی موسن، مسلم، مقنی اور محسن بنائے بغیر لوگوں کو متقویوں کے ظاہری ساتھے میں ڈھانے کی کوشش کی جائے اور ان سے محسین کے چند مشہور و مقبول عام افعال کی نقل اتروانی جائے۔ یہ سیئے اور تابے کے نکلوں پر اشرفی کامیابی کا کردار میں ان کو چلا دیتا، اور سپاہیت، وفاداری اور جان ثاری پیدا کیے بغیر زے وردی پوش نمائش سپاہیوں کو میدان میں لاکھڑا کرنا میرے نزدیک تو ایک کھلی ہوئی جعل سازی ہے۔ اور اسی جعل سازی کا نتیجہ ہے کہ نہ بازار میں آپ کی ان جعلی اشرفیوں کی کوئی قیمت اٹھتی ہے اور نہ میدان میں آپ کے ان نمائش سپاہیوں کی بھیڑ سے کوئی معزکہ سر ہوتا ہے۔

پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ خدا کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ فرض کیجیے کہ ایک شخص سپاہیاں رکھتا ہے، فرض شناس ہے، اخلاقی صالح سے متصف ہے، حدود اللہ کا پابند ہے اور خدا کی وفاداری اور جان ثاری کا حق ادا کر دیتا ہے، مگر ظاہری فیشن کے اعتبار سے ناقص اور ظاہری تہذیب کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس بھی تو ہو گی کہ ایک اچھا ملازم ہے مگر ذرا بد تمیز ہے۔ ممکن ہے کہ اس بد تمیز کی وجہ سے اس کو مرابت عالیہ نصیب نہ ہو سکیں، مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قصور میں اس کی وفاداری کا اجر بھی مارا جائے گا اور اس کا مالک صرف اس لیے اسے جہنم میں جھوک دے گا کہ وہ خوش وضع اور خوش اطوار نہ تھا؟ فرض کیجیے کہ ایک دوسرا شخص ہے، جو بہترین شرعی فیشن میں رہتا ہے اور آداب تہذیب کے الزام میں کمال درج محتاط ہے۔ مگر اس کی وفاداری میں نقص ہے، اس کی فرض شناسی میں کمی ہے، اس کی غیرت ایمانی میں خامی ہے۔ آپ کیا اندازہ کرتے ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اس ظاہری کمال کی حد سے حد کتنی قدر خدا کے ہاں ہو گی؟ یہ مسئلہ تو کوئی گہر اور پیچیدہ قانونی مسئلہ نہیں ہے، جسے سمجھنے کے لیے کتابیں کھلانے کی ضرورت ہو۔ مخفی عقل عام ہی سے ہر آدمی جان سکتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے اصلی قدر کی مستحق کون ہی چیز ہے۔ دنیا کے کم عقل لوگ بھی اتنی تمیز ضرور رکھتے ہیں کہ حقیقت میں جو چیز قابل قدر ہے اس میں اور خوبی خوبیوں میں فرق کر سکیں۔ یہ انگریزی حکومت آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جیسے کچھ فیشن پرست ہیں اور ظاہری آداب و اطوار پر جس طرح جان دیتے ہیں اس کا حال آپ کو معلوم ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں ان کے ہاں اصلی قدر

کس چیز کی ہے؟ جو فوجی افسر ان کی سلطنت کا جھنڈا بلند کرنے میں اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری وقتیں صرف کر دے اور فیصلے کے وقت پر کوئی قربانی دینے میں دریغ نہ کرے، وہ ان کے نقطہ نظر سے خواہ کتنا ہی اجڑا اور گنوار ہو، کئی کئی دن شیونہ کرتا ہو، بے ڈھنگا بس پہنتا ہو، کھانے پینے کی ذرا تمیز نہ رکھتا ہو، رقص کے فن سے بابد ہو، مگر ان سارے عیوب کے باوجود وہ اس کو سرا آنکھوں پر بھائیں گے اور اسے ترقی کے بلند ترین مرتبے دیں گے۔ بخلاف اس کے جو شخص فیش، تہذیب، خوش تیزی اور سوسائٹی کے قبولی عام اطوار کا معیاری مجسم ہو، لیکن وفاداری و جان ثاری میں ناقص ہو اور کام کے وقت اپنے مصالح کا زیادہ لحاظ کر جائے اسے وہ کوئی عزت کا مقام دینا تو درکار نہ شاید اس کا کورٹ مارشل کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ یہ جب دنیا کے کم عقل انسانوں کی معرفت کا حال ہے تو اپنے خدا کے متعلق آپ کا کیا گمان ہے؟ کیا وہ سونے اور تابنے میں تیز کرنے کے بجائے محض سطح پر اشرفتی کا ٹھپسہ دیکھ کر اشرفتی کی قیمت اور پیسہ کا ٹھپسہ دیکھ کر پیسے کی قیمت لگادے گا؟

میری اس گزارش کو یہ معنی نہ پہنا یئے کہ میں ظاہری محسن کی لنگی کرنا چاہتا ہوں یا ان احکام کی تعمیل کو غیر ضروری قرار دے رہا ہوں، جو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی اصلاح و درستی کے متعلق دیے گئے ہیں۔ درحقیقت میں تو اس کا قائل ہوں کہ بندہ مومن کو ہر اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے، جو خدا اور رسول نے دیا ہو اور یہ بھی مانتا ہوں کہ دین انسان کے باطن اور ظاہر دونوں کو درست کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جو چیز میں آپ کے ذہن نہیں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مقدم چیز باطن ہے نہ کہ ظاہر پہلے باطن میں حقیقت کا جو ہر پیدا کرنے کی فکر کیجیے، پھر ظاہر کو حقیقت کے مطابق ڈھالیے۔ آپ کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان اوصاف کی طرف توجہ کرنی چاہیے، جو اللہ کے ہاں اصل مقصود تھا۔ ظاہر کی آرائشی اول تو ان اوصاف کے نتیجے میں فطرت آنحضرت ہی اور اگر اس میں کچھ کسر رہ جائے تو تکمیلی مرحل میں اس کا اہتمام بھی کیا جاسکتا ہے۔

دوستو اور فیقو! میں نے بیماری اور کم زوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپ کے سامنے صرف اس لیے کی ہے کہ میں امر حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتباً نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی مہلت

عمر آن پوری ہو۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حق پہنچانے کی، جوڑے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اس سے سبک دوش ہو جاؤں۔ اگر کوئی امر و ضاحت طلب ہو تو پوچھ لیجیے۔ اگر میں نے کوئی بات خلاف حق بیان کی ہو تو اس کی تردید کر دیجیے۔ لیکن اگر میں نے مُحیک مُھیک حق آپ تک پہنچا دیا ہے تو آپ بھی اس کے گواہ رہیں اور خدا بھی گواہ ہو۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ کو سب کو اپنے دین کا صحیح فہم بخشنے اور اس فہم کے مطابق دین کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین
